R. No. 2186/57 REGD-No-L-922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت: ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

جلد ۲۸، شمارہ ۲۳ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ر جون ۱۹۶۹ء

آل احمد سرور

نریش کمار شاد

نریش کمار شاد سے میری پہلی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی۔ آزادی کے کچھ دن بعد ساحر ہوشیارپوری اور نریش کمار شاد نے کانپور سے "چندن" نکالا۔ یہ پرچہ بڑی دھوم دھام سے نکلا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مگر چونکہ اس کے ایڈیٹر ادبی رسالہ کامیابی سے چلانے کے فن سے ناواقف تھے اس لئے تھوڑی مدت کے بعد بند ہو گیا۔ مگر لکھنؤ کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں نریش کمار کی طباعی اور ذہانت، نوعمری کے باوجود فن پر قدرت اور ایک دلکش انفرادیت کے چرچے ہونے لگے۔ خصوصاً اس کے قطعات نے بہت جلد اہل نظر کی توجہ اپنی طرف کرلی۔

نریش کمار شاد نے ساری عمر کلرکی کی، مگر اس کے اندر کا شاعر جو بڑا بانکپن رکھتا تھا اس کے باوجود زندہ رہا۔ اسے بڑے مشکل حالات سے گزرنا پڑا، مگر اس نے بڑی مردانگی سے ان کا مقابلہ کیا۔ اتنی کم عمری میں اس نے نظم و نثر میں جو لکھا ہے وہ کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ غزل، نظم، قطعہ، رباعی سب پر یکساں قدرت رکھتا تھا۔ فطرتاً رومانی تھا، مگر مطالعہ نے اور شعور نے اسے وہ نظر بھی عطا کردی تھی جو زندگی کے حقائق تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کی نثر بھی صاف، واضح اور مدلل ہوتی تھی۔ اپنے قدیم ادب پر اس کی نظر گہری تھی؛ وہ فن کے رموز سے واقف تھا۔ ادیبوں اور شاعروں کی خصوصیات بڑی خوبی سے بیان کر سکتا تھا، موقع اور محل کے مطابق اشعار پیش کر سکتا تھا۔ روایت کا احساس رکھتا تھا، مگر تجربوں سے خائف نہ تھا۔ وہ ہمارے ان شاعروں میں سے تھا جن سے بجا طور پر بلند ترین توقعات وابستہ کی جاتی ہیں۔ وہ اچھا دوست تھا، دلچسپ رفیق تھا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایک صاحب طرز ادیب اور شاعر تھا۔

مگر اس میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی۔ وہ بے تحاشا شراب پیتا تھا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے اس نے غم غلط کرنے کے لئے شراب کو منہ لگایا تھا، مگر بالآخر شراب نے ہی اس کی جان لے لی۔ مرنے سے چند ماہ پہلے وہ اپنے والد کی گمشدگی کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ اب تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کیا ہوئے لیکن غالباً ان کی شراب نوشی انھیں لے ڈوبی۔ نریش کمار شاد کو یہ بلانوشی باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ کئی دفعہ بیمار پڑا۔ کئی دفعہ مرتے مرتے بچا۔ کئی دفعہ توبہ کی۔ کئی دفعہ توڑی۔ شراب کی لت حد سے بڑھ جائے تو دماغی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ ۳۱ مئی کی شب میں شاد جمنا کی طرف گیا۔ صبح کو اس کی لاش ملی۔ قیاس یہ ہے کہ اس نے خودکشی کی مگر یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اختر شیرانی، مجاز، منٹو، نریش کمار شاد، کی جوانی میں موت کچھ کہتی ہے۔ ان لوگوں کے مرنے پر عام طور پر لوگ ظالم سماج کو کوستے ہیں۔ کوئی سچی بات نہیں کہتا۔ ہم محتسب نہیں۔ ہمیں لوگوں کی ذاتی زندگی کے متعلق کرید نہیں ہونی چاہئے مگر کچھ شاعروں اور ادیبوں کے اس مرض پر کچھ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ جو لوگ مشاعروں کی رونق بڑھانے کے لئے ان شعرا کو خوب پلاتے ہیں اور پھر ان کی بدمستی کو گوارا کرتے ہیں، دراصل یہ لوگ ان شاعروں اور ادیبوں کی تباہی کے ذمہ دار ہیں۔ مفت کی ملتی ہو تو شراب کو ہاتھ نہ لگانا شراب کے دلدادہ حضرات کے لئے مشکل ہے۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں ادب اور تہذیب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اگر ان حضرات کو جو بدمست ہیں، مشاعروں میں پڑھنے نہ دیا جائے تو میرا خیال ہے کہ ان کی خاصی اصلاح ہو جائے گی۔ مجھے یاد ہے چین نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تھا تو جگہ جگہ دفاع کے لئے چندہ کرنے کے لئے مشاعرے ہوئے تھے۔ ایک مشاعرہ شعیب محمدیہ ہائی اسکول آگرہ میں ہوا جس کا صدر میں تھا۔ اس میں نشور واحدی، نریش کمار شاد، گلزار دہلوی اور بہت سے

شعر سنتے۔ شروع میں شاد ہوش میں تھے۔ انھوں نے بہت اچھی نظمیں سنائیں بعد میں یاروں نے خوب پلائی۔ نصف شب کے بعد جب مشاعرہ جما ہوا تھا اور نشور واحدی اپنی غزل پڑھنے بیٹھے تھے تو شاد جھومتے جھامتے داخل ہوئے اور نشور کے گلے میں باہیں ڈال کر کہنے لگے کہ نشور غزل کا رمز شناس ہے۔ نشور نے مطلع پڑھا تو دوسروں کے ساتھ شاد نے بھی داد دی۔ مگر دو تین اشعار سننے کے بعد شاد کا موڈ بدل گیا اور بلند آواز سے کہنے لگے کیا لغو شعر ہے۔ غرض محفل میں سخت بدمزگی پیدا ہو گئی۔ میں نے شاد کی بیوی کو اشارہ کیا۔ وہ کسی نہ کسی طرح انھیں اٹھا کر لے گئیں ورنہ نہ معلوم کیا ہنگامہ ہوتا۔ بدمستی کے ایسے مظاہروں نے بہت سے مشاعروں کو چوپٹ کیا ہے۔

ادیبوں اور شاعروں کا احترام ضروری ہے۔ ان کی قدر کرنی چاہیے۔ ان کے مالی حالات کو بہتر بنانا چاہیے مگر ان کی کمزوریوں کو کمزوریاں سمجھنا چاہیے۔ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں سنجیدگی اور آداب محفل پر اصرار کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ شاد کے احباب اسے بروقت ٹوکتے تو اس کی اصلاح ہو جاتی اس میں بڑی جان تھی۔ اس نے حالات کا خاصا مقابلہ کیا۔ مگر بالآخر اس کی بدمستی اسے لے ڈوبی۔ کاش ہمارے ادیب اور شاعر اس کی زندگی سے سبق لے سکیں۔ اتنا اچھا شاعر اور زندہ رہتا تو وہ ادب کو کتنا مالا مال کرتا۔

ڈاکٹر اختر احمد کی ایک تصنیف کو انعام

حیدرآباد:۔ ساہتیہ اکیڈیمی آندھرا پردیش نے ڈاکٹر اختر احمد کی کتاب اسرار کائنات و اشرف المخلوقات کو بہترین کتابوں میں شمار کرتے ہوئے اس کتاب کو انعام دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کتاب علی گڑھ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔ اختر احمد کی یہ دوسری کتاب ہے جسے ساہتیہ اکیڈیمی کا اعزاز حاصل ہوا ہے وہ اپنی اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں اور انگریزی کتاب MAN AND SECRETS OF UNIVERS زیر طبع ہے۔ اس کتاب میں فلسفہ، مذہب، انسانیت، اخلاق اور کائنات سے متعلق مسائل کا سائنٹفک انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔

اٹلی میں لینن کی تصنیفات کی اشاعت

روم:۔ اطالوی کمیونسٹ پارٹی کا اشاعت گھر "ایڈیتوری ری یونیتا" کے ایڈیٹر انچیف جی۔ گاریتانو نے تاس کے نامہ نگار کو بتایا کہ لینن کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب کے سلسلے میں اٹلی میں لینن کی کل تصنیفات کی اشاعت کی جائے گی "ایڈیتوری ری یونیتا" اشاعت گھر کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ سوویت ریاست کے بانی کی تصنیفات کی ۴۵ جلدوں میں سے اب تک ۳۹ جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور سال کے اختتام تک دیگر ۶ جلدیں شائع ہو جائیں گی۔

منشورات

دہلی:۔ برج موہن دتاتریہ کیفی کے علمی، ادبی اور لسانیاتی مضامین کا مجموعہ منشورات جسے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مرتب کیا ہے انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

قیمت عرض ہنر کی اشاعت

حیدرآباد ہند و پاک کے ممتاز اردو غزل کے منفرد شاعر جناب خورشید احمد جامی کی شخصیت اور شاعری پر مضامین نظم و نثر اور انتخاب کلام پر مشتمل کتاب "قیمت عرض ہنر" جولائی کے دوسرے ہفتے تک چھپ جائے گی۔ اس کتاب میں ہندوستان کے ممتاز نقادوں، ادیبوں اور شاعروں نے جامی کے فن اور ان کی شخصیت پر مضامین لکھے ہیں۔ جشن جامی تیاری کمیٹی آندھرا پردیش حیدرآباد کی طرف سے یہ کتاب شائع کی جا رہی ہے مزید تفصیلات کے لئے "شاہیار ۲۸۷- بی ملک پیٹھ جدید حیدرآباد دکن ۳۶" سے ربط پیدا کیا جا سکتا ہے۔ (نامہ نگار)

صفحہ ۶ سے آگے

نہیں تو بیگم غالب (۲) نے اپنے بھانجے زین العابدین عارف (۴) کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ لیکن عین عالم شباب میں عارف کا بھی ۱۸۵۲ء میں انتقال ہو گیا اور غالب ان کے دونوں بیٹوں باقر علی خاں (۵) اور حسین علی خاں (۶) کو اپنے پاس لے آئے اور اپنی اولاد کی طرح ان کی پرورش کی۔ اپنی زندگی میں ہی غالب نے باقر علی خاں (۵) کی معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم (۱۵) سے شادی کی تھی۔ تقریباً نوے سال کی عمر میں بگا بیگم سے پروفیسر حمید احمد خاں نے جولائی ۱۹۳۸ء میں ملاقات کی تھی اور ان سے غالب کی خانگی زندگی کے بارے میں کئی سوالات کئے تھے اس ملاقات کی تفصیل انھوں نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کی ہے جو پہلے "آج کل" دہلی میں شائع ہوا تھا اور اب پبلیکیشنز ڈویژن، گورنمنٹ آف انڈیا، دہلی کی مرتبہ "آئینۂ غالب" میں شامل ہے۔

(تسین) محمد خاں اور خسرو جہاں بیگم کی نسبت کے بارے میں ملاحظہ فرمائیے۔ "تاریخ آلگہ بھوپال" از منشی سید مہدی علی سہوانی مطبع عالی جاہ مقام لشکر گوالیار ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۵ء) صفحہ ۲۶ (حاشیہ صفحہ ۲۷ و غلط نامہ صفحہ ۲)

ہماری زبان

سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ (منیجر)

ڈاکٹر عبدالودود

مشرقی و مغربی ہندی کا تصوّر اور ہمارے ماہرین لسانیات

زبان اور بولی میں کیا فرق ہے اس پر بہت لکھا جا چکا ہے، ہم اسے دہرانا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ صرف اتنا ہی کہنا چاہیں گے کہ "زبانیں "ترقی یافتہ بولیاں ہیں۔ بولیوں کو وہ "تہذیبی حیثیت" حاصل نہیں ہوتی جو زبان کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ بولی زبان بن جاتی ہے جسے خیالات کے تحریری اظہار کے لیے اپنا لیا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ایک زبان بولنے والے بولیوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک خاص قسم کے ماحول میں رہنے والے صرف ایک زبان بولتے ہوں اور دوسری بولیوں سے ناواقف ہوں۔ ایسے لوگوں کی کثیر تعداد نظر آتی ہے جو عموماً بھوجپوری، اودھی، برج، مالوی، سنتھالی، چھتیس گڑھی، بگھیلی، بندیلی، قنوجی اور راجستھانی (راجستھان کی بہت سی بولیاں) وغیرہ بولتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کی مادری بولی "یہی بولیاں ہیں۔ انھوں نے اردو یا ہندی کو "تہذیبی زبان" کے طور پر اختیار کر لیا ہے اور اردو یا ہندی کو اپنی مادری زبان کہنے لگے ہیں جب یہ کہا جاتا ہے کہ اتنے کروڑ افراد کی مادری زبان اردو ہے اور اتنے کروڑ افراد کی مادری زبان ہندی ہے تو یہ بڑی عجیب سی بات ہوتی ہے۔ یہ غلطی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ بہت سی بولیوں کو ہندی یا ہندی کی بولی کہنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جن کے نزدیک اردو کی تہذیبی اہمیت ہے، اردو کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں۔

اردو اور ہندی کے آغاز و ارتقا پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کام کا آغاز اہل مغرب نے کیا اور ان کی تقلید اردو، ہندی کے ماہرین لسانیات نے کی۔ گریرسن کے لسانی جائزے کو حرفِ آخر کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اردو، ہندی کے ماہرین لسانیات اس کے نظریات کے ہی ترجمان ہیں۔ اردو کے مقابلے میں ہندی میں لسانی موضوعات پر بہت زیادہ کام ہوا ہے۔ ہندی زبان و ادب کی تاریخوں میں لازماً اردو کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ اردو پر ہندی کی برتری ثابت کرنے کی کوشش ہی نہیں کی جاتی بلکہ اردو کو بہت معمولی اور محدود زبان ثابت کیا جاتا ہے۔ اس طرح علمی سطح پر اردو کے خلاف ایک فضا بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ اردو کے ماہرین لسانیات، ہندی کے ان لسانی کارناموں پر گہری نظر رکھتے ہیں لیکن ان پر نہ اپنی رائے دیتے ہیں اور نہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس سے اردو زبان و ادب کی "تاریخ" کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بہت سی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اردو کی مخالفت کرنے والوں کی باتیں سُنی جاتی ہیں لیکن ان کے نظریہ کو غلط ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقا پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ہماری رہنمائی نہیں ہو پاتی۔

اصل مسئلہ مشرقی اور مغربی ہندی کا ہے جو بڑی الجھنیں پیدا کرتا ہے اردو اور ہندی دونوں ہی کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں لیکن اردو نے آس پاس کی بولیوں کے ادب سے کوئی واسطہ نہ رکھا اور ہندی نے برج، اودھی، راجستھانی وغیرہ کے ادب کو نہ صرف اپنایا بلکہ اسے ہندی ادبیات کا جزو بنا لیا۔ اس طرح ہندی ادب کی تاریخ کئی سو سال کی تاریخ ہو جاتی ہے ہم ہندی کو نہ اتنی قدیم زبان سمجھتے ہیں اور نہ ہی برج، اودھی اور راجستھانی کی شاعری کو ہندی کہنا پسند کرتے ہیں تلسی داس، قطبن، عثمان، منجھن، نور محمد، رس خان، میرا بائی وغیرہ کی زبان ہندی سے بالکل مختلف ہے۔ انھیں ہندی کا شاعر کہنا اور ان کی شاعری کو ہندی کہنا تاریخی اور لسانی اعتبار سے غلط اور گمراہ کن ہے۔ اسے تو ہم ہندی زبان و ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی فکر میں کی گئی ایک غیر علمی کوشش ہی کہہ سکتے ہیں۔

مشرقی اور مغربی ہندی کا تصور گریرسن کی ذہنی اختراع ہے۔ اس نے مشرقی ہندی کے گروہ میں اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی کو اور مغربی ہندی کے گروہ میں بندیلی، قنوجی، برج بھاشا اور "سٹینڈرڈ ہندوستانی" کو شامل کیا ہے۔ اس "سٹینڈرڈ ہندوستانی" کو وہ لنگوا فرینکا کہتا ہے۔

ایم۔ اے شمیم

دیوارِ فنا

(صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے سانحہ ارتحال پر)

عشق نے زیست کے انداز کو بخشا ہے دوام
نام سے اپنے اجل آپ ہی شرمندہ ہے
زندگی ایک شرر زودِ فنا ہے پھر بھی؛
مثل انجم فلکِ ہستی[1] پہ تابندہ ہے
زیست کا جام ہو گر عشق کی مے سے لبریز
اس کا ہر نقشِ حسیں زندہ و پائندہ ہے
پردۂ ابر میں یا رو! مہ و انجم کی طرح
زندگی بھی پسِ دیوارِ فنا زندہ ہے
آبروئے چمن دہر ہے جوں موجِ شمیم
زندگی عشق کے انوار سے تابندہ ہے
گل کے اوصاف تو باقی ہیں جو گل فانی ہے
موت "ذاکر" کی سمجھتے ہو تو نادانی ہے

[1] دانستہ استعمال کیا گیا ہے

گریرسن کی یہ تقسیم بہت ہی غلط اور غیر سائنٹفک ہے۔ مختلف بولیوں کے گروہ کو مشرقی و مغربی ہندی کا نام دینے سے یہ گمان گزرتا ہے کہ یہ بولیاں مشرقی ہندی و مغربی ہندی کی شاخیں ہیں۔ اس کی یہ تقسیم گمراہ کن ہے۔ اردو زبان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کو تو اور زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ گریرسن نے جب لسانی جائزے کی ترتیب کی، اس وقت ایک طرف تو کھڑی بولی کا ہندی روپ ترقی کر رہا تھا اور دوسری بولیوں کے تمام سرمائے کو ہندی کہا جانے لگا تھا، اس نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ ان تمام بولیوں کو ہندی کہنا کہاں تک صحیح ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"ہندی نام عام طور سے ان تمام آریائی زبانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو مغرب میں پنجاب، اور مشرق میں مہانندا، شمال میں ہمالہ اور جنوب میں نربدا کے درمیان بولی جاتی ہیں۔"

تعجب ہے کہ گریرسن مختلف زبانوں کے لیے استعمال ہونے والے ہندی نام پر معترض نہیں ہوتا اور اس علاقہ کی تمام زبانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اس نے بہاری اور راجستھانی کو الگ گروہ مانا ہے لیکن اس کے بعد کے ماہر لسانیات انھیں بھی ہندی مان لیتے ہیں۔

اردو زبان کے آغاز و ارتقا پر مضامین و کتابیں لکھنے والے اصحاب قلم نے گریرسن کے اس کلیہ کو صحیح مان لیا ہے۔ محض گریرسن کی تقلید کی گئی ہے اور اس کے نظریات کا اردو ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ گریرسن کے نظریہ سے ہندی کو ضرور فائدہ پہنچا۔ اس کا یہ بے بنیاد نظریہ ہی اردو کو ہندی کی ایک شیلی کہلوا رہا ہے۔ شوکت سبزواری نے اپنی تصنیف "اردو زبان کا ارتقا" میں مغربی ہندی کے غلط تصور پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مغربی ہندی کا تصور ایک طرح کی ذہنی تجزیہ یا منطقی اپج ہے۔ دہلی اور اس کے نواح کی بولیوں میں غیر معمولی مشابہتیں دیکھ کر دانایان مغرب کو خیال ہوا کہ وہ اس کا متحد ماخذ قرار دیں۔ چنانچہ مغربی ہندی کے نام سے ایک زبان فرض کر کے انھوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ زبان گیارہویں صدی عیسوی میں ہریانی، برج، کھڑی، قنوجی، اور بندیلی کے وسیع و عریض علاقہ میں بولی جاتی تھی۔ یہ بولیاں اس زبان کی کوکھ سے پیدا ہوئیں۔"

شوکت سبزواری اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ سبزواری کی تصنیف ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے مغرب کے اہل قلم کے نظریات و مفروضات سے اختلاف تو کیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تصنیف "مقدمۂ تاریخ زبان اردو" بڑی اہم تصنیف مانی جاتی ہے۔ یقیناً یہ اردو زبان کے آغاز و ارتقا پر پہلی جامع تصنیف ہے لیکن ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب بھی ہمیں کوئی نیا نظریہ نہیں دیتے۔ گریرسن کے لسانی جائزے کی جلدیں جس نے بھی دیکھی ہیں اسے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تصنیف میں کوئی نیا پن نظر نہ آئے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی مشرقی و مغربی ہندی کے فرضی تصور پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور گریرسن کی تقسیم کو صحیح مان لیا۔

پروفیسر احتشام حسین صاحب نے جان بیمز کی تصنیف "ہندستانی لسانیات کا خاکہ" کے ترجمے کے ساتھ جو مقدمہ شامل کیا ہے وہ بھی بڑا مفصل ہے اس سے احتشام صاحب کے نظریات کا اندازہ ہوتا ہے احتشام صاحب بھی نئی خاندانی تقسیم نہیں کرتے۔ لکھتے ہیں :-

"وسطی ہند آریائی پراکرتوں میں پالی سب سے اہم ہے لیکن اردو ہندی کا مطالعہ کرنے والوں کو شورسینی کا نام ذہن میں رکھنا چاہیے کیونکہ یہی شورسینی پراکرت کچھ دنوں کے بعد اپ بھرنش میں تبدیل ہوئی اور پھر مغربی ہندی اور مشرقی پنجابی کی مختلف شکلوں کی ماں بن گئی جن میں اردو اور ہندی بھی شامل ہے۔"

اس اقتباس کے سب سے اہم الفاظ "مغربی ہندی اور مشرقی پنجابی کی مختلف شکلوں کی ماں بن گئی" ہیں۔ اس سے ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ احتشام صاحب بھی "مختلف شکلوں (اردو، ہندی (کھڑی بولی)، قنوجی، بندیلی اور برج وغیرہ) کو مغربی ہندی ہی کی شاخ تصور کرتے ہیں۔ جب اپ بھرنش مغربی ہندی کی مختلف شکلوں کی ماں ہے تو اس مغربی ہندی کا اپ بھرنش سے کیا رشتہ ہے اور یہ اصطلاح کیوں استعمال کی جاتی ہے!

مغربی ہندی کے ساتھ ساتھ مشرقی ہندی کی اصطلاح بھی رائج ہے۔ احتشام صاحب بھی مشرقی ہندی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں لیکن مشرقی ہندی کیا ہے یہ نہیں بتاتے۔ اودھی کا ذکر کرتے ہوئے احتشام صاحب لکھتے ہیں :-

"مشرقی ہندی کی بولیوں میں اودھی سب سے اہم ہے یہ اردو ماگدھی سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے ...... کبیر داس، قطبن، ملک محمد جائسی اسی زبان کے ہیں۔ ادبی حیثیت سے اس کی جگہ اردو اور ہندی نے لے لی۔"

اودھی کی جگہ ایک طرف اردو نے لی تو دوسری طرف برج نے۔ برج کی جگہ ہندی نے لے لی۔ انیسویں صدی کے آخر تک برج کی شاعری مقبول رہی، کھڑی بولی (ہندی) کی تحریک نے برج کو ختم کر دیا۔

برج کا ذکر کرتے ہوئے احتشام صاحب لکھتے ہیں :-

"برج بھاشا نے مغلوں کے زمانے میں (اور خاص کر آگرہ دارالخلافت بن جانے کی وجہ سے) اتنی اہمیت اختیار کر لی کہ بہت دنوں تک ہندی شاعری کی یہی زبان رہی۔"

اس جملے میں ہمیں "ہندی شاعری" پر اعتراض ہے۔ یہاں

اتنا لکھنا ہی کافی ہوتا کہ "بہت دنوں تک شاعری کی یہی زبان رہی"۔

ہندی زبان و ادب کے مورخین وہ دوسرے ماہرین لسانیات کا نظریہ جو کچھ بھی ہو ہمارا اپنا نقطۂ نظر ہونا چاہیے۔ اردو کے ماہرین لسانیات کو چاہیے کہ وہ ہندی کا صرف اس زبان کو کہیں جو کھڑی بولی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ ہم پراکرتوں اور اپ بھرنشوں کو جتنی اہمیت دیتے ہیں اتنی ہی اہمیت ان بولیوں کو دینی چاہیے۔ ہماری زبان و ادب کی تاریخ دو حصوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ ایک حصہ کو قدیم ہندی اور دوسرے حصہ کو جدید ہندی کہتے ہیں۔ قدیم ہندی میں ان تمام بولیوں کا ادب شامل کیا جاتا ہے جو مغربی ہندی و مشرقی ہندی کی بولیاں کہی جاتی ہیں۔ جدید ہندی کھڑی بولی کی اس شکل کو کہتے ہیں جو آج ہماری قومی زبان ہے۔ اگر قدیم جدید کی اس تقسیم کو مان بھی لیا جائے تب بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کھڑی بولی کی ان تحریروں کو قدیم کہا جائے گا یا جدید جو فورٹ ولیم کالج کی تحریروں سے پہلے نظر آتے ہیں۔ احتشام صاحب لکھتے ہیں کہ "ہندی کوئی مخصوص زبان نہیں تھی اودھی برج بھاشا بھوجپوری ہندی بہاری سب الگ الگ یا مل کر ہندی کہی جاتی تھیں" جب ہم یہ جانتے ہیں کہ ہندی کوئی مخصوص زبان نہ تھی تو گریرسن کی اس تقسیم کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ اس احساس کے باوجود مشرقی ہندی و مغربی ہندی وغیرہ اصطلاحات کا استعمال کیا جانا مناسب نہیں ہے۔

ڈاکٹر گیان چند بھی مشرقی و مغربی ہندی کے نظریہ کو صحیح مانتے ہیں حالانکہ ان کے یہ جملے بیں وبیش کے بھی غماز ہیں۔ مغربی اور مشرقی ہندی کے تصور کو صحیح ماننے کے لیے وہ جو وجہ جواز پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے:۔

"پراکرتوں اور اپ بھرنشوں میں نئی زبان کے حسب نسب کا کھوج لگانا بڑا پیچیدہ کام ہے، پھر بھی ہم یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ مغربی ہندی شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش کی جانشین ہے اور مشرقی ہندی اردھ ماگدھی پراکرت اور اردھ ماگدھی اپ بھرنش کی"۔

لیکن یہ فرض کر لینے سے کہ شورسینی اپ بھرنش کی جانشین مغربی ہندی اور اردھ ماگدی اپ بھرنش کی جانشین مشرقی ہندی رہی ہوگی مسئلہ نہیں سلجھ پاتا۔ اب تک ایسی تحریریں فراہم نہیں ہو سکی ہیں جنھیں مغربی ہندی یا مشرقی ہندی کا نام دیا جا سکے۔ اگر ایسے نمونے فراہم بھی ہو جائیں جنھیں ان تمام بولیوں کا (جو مشرقی و مغربی ہندی کی بولیاں کہی جاتی ہیں) ماخذ قرار دیا جا سکے تو کیا ضروری ہے کہ ہم انھیں مشرقی یا مغربی ہندی کہیں۔ ان کے لیے پراکرت یا اپ بھرنش کی طرح کوئی دوسری اصطلاح اختیار کی جا سکتی ہے۔ مشرقی و مغربی ہندی کے تصور کو اردو زبان کی تاریخ میں کوئی جگہ نہیں ملنی چاہیے۔

گریرسن نے مشرقی و مغربی ہندی کی جو گروہ بندی کی ہے اس کی کوئی سائنٹیفک بنیاد نہیں ہے۔ نہ تو مشرقی ہندی کا وجود تھا اور نہ مغربی ہندی کا۔ مشرقی و مغربی ہندی کے گروہ میں جن بولیوں کو شامل کیا جاتا ہے ہم انھیں ہندی نہیں کہہ سکتے۔ کھڑی بولی، برج اور دوسری بولیوں کے تقابلی مطالعہ سے بھی اس فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ماہرین لسانیات مشرقی ہندی، مغربی ہندی، قدیم ہندی، جدید ہندی کی اصل حیثیت سے پوری طرح واقف ہیں۔ سب ہی یہ جانتے ہیں کہ قدیم ہندی کئی بولیوں کے مجموعے کا نام ہے۔ بولیاں کھڑی ہندی سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ ہمارے ماہرین لسانیات نے اپنا کوئی منفرد نقطۂ نظر نہیں پیش کیا۔ ہمارا خیال ہے کہ مشرقی و مغربی ہندی کے فرضی تصور کو اہمیت نہ دینی چاہیے۔ کھڑی بولی اور دوسری بولیوں کا اپ بھرنشوں سے سیدھا تعلق ہے۔ گریرسن کے اس تصور سے ہندی زبان و ادب کے مورخین نے فائدہ اٹھایا اور اردو زبان کے مورخین نے تقلیدی روش اختیار کر کے بہت سی الجھنیں پیدا کر دیں۔

شیخ احمد آبادی

○

اک ایک سانس شکوۂ اغیار کی طرح
برسائے دل پہ تیر ستمگار کی طرح

مانند برگ خشک اڑا ہم کو رات دن
لیکن ہوائے دہر کسی یار کی طرح

میں جسم کے کنوئیں میں پڑا ہوں یہ ٹھیک ہے
دنیا کھڑی ہے مصر کے بازار کی طرح

یوں میرے ساتھ ساتھ رہا دھوپ میں مگر
ملتا ہے کب وہ سایۂ دیوار کی طرح

رنگ حنا میں ڈوب گئی وہ لکیر بھی
جو مضطرب تھی میرے دل زار کی طرح

ڈاکٹر سید حامد حسین

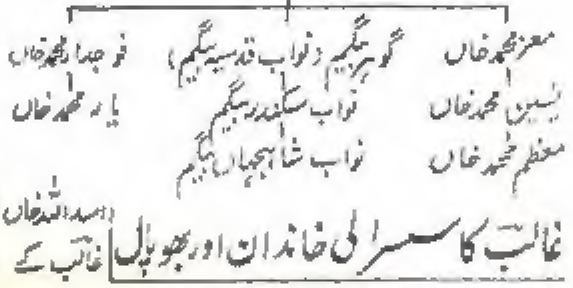
بھوپال کی غالب سے قرابت

غالب اور بھوپال

بھوپال سے غالب کے تعلق کے بارے میں بات کرتے ہوئے سب سے پہلے ذہن غالب کے دیوان کے اس قلمی نسخہ کی جانب متوجہ ہوتا ہے جو میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانہ کی زینت تھا اور جس میں غالب کا وہ نادر کلام بھی محفوظ تھا جسے متداول نسخوں میں شامل نہیں کیا گیا۔ غالب کا بھوپال سے ایک اور تعلق ان چند شعراء کے وسیلے سے پیدا ہوتا ہے جنھیں غالب کا شاگرد بتایا جاتا ہے۔ انھیں میں فوجدار محمد خاں کے صاحبزادے یار محمد خاں شوکت بھی شامل ہیں جن کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ دہلی جاکر غالب سے ملے اور ان کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے لیکن بھوپال کے اسی شاہی خاندان سے بعد میں غالب کے سسرالی خاندان کا جو رشتہ پیدا ہوا اس کی جانب ابھی تک توجہ نہیں کی گئی ہے۔

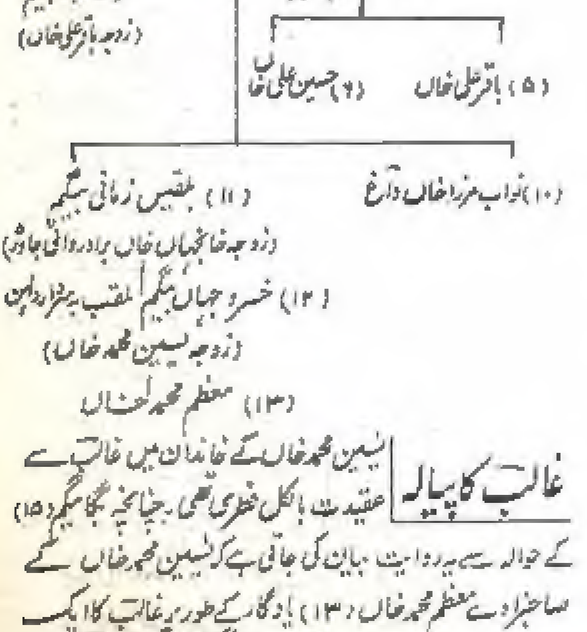
بھوپال کا شاہی خاندان اور غالب

نواب غوث محمد خاں ریاست بھوپال کے پانچویں فرمانروا تھے۔ دوسری اولاد کے علاوہ ایک افغانی خاتون چاندنی بیگم کے بطن سے غوث محمد خاں کے دو صاحبزادے معز محمد خاں اور فوجدار محمد خاں اور ایک صاحبزادی گوہر بیگم تھیں۔ گوہر بیگم بعد میں نواب قدسیہ بیگم کے نام سے مختار ریاست ہوئیں۔ ان کے چھوٹے بھائی فوجدار محمد خاں نے بھی نواب جہانگیر محمد خاں کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ کے لیے ریجنٹ کے فرائض سر انجام دیے لیکن ان کا سب سے نمایاں وصف ان کی علم و ادب سے دلچسپی تھی جس کا نتیجہ ان کا وہ کتب خانہ تھا جس میں ۱۲۳۷ھ میں تحریر کیا ہوا دیوان غالب کا قلمی نسخہ محفوظ رہا۔ معز محمد خاں اپنے عہد میں اہم سیاسی حیثیت کے مالک تھے اور اس وقت کی معرکہ آرائیوں میں انھوں نے انتہائی نمایاں حصہ لیا۔ انھیں معز محمد خاں کے صاحبزادے یسین محمد خاں نے غالب کے سسرالی خاندان میں شادی کی۔ مندرجہ ذیل شجرہ شاہی خاندان کے ان رشتوں کو بخوبی واضح کرے گا۔



غالب کا سسرالی خاندان اور بھوپال

اسد اللہ خاں غالب کے والد عبداللہ خاں بیگ کا جب انتقال ہوا، اس وقت غالب کی عمر صرف پانچ سال کی تھی۔ چنانچہ ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے کی۔ جب سن بلوغ پر پہنچنے پر غالب کی شادی کی فکر ہوئی تو ان کی چچی (۷) نے اپنے بھائی الٰہی بخش خاں معروف (۱) کی صاحبزادی امراؤ بیگم (۲) سے ان کی نسبت طے کی (ناموں کے سامنے نمبرات کا حوالہ مندرجہ ذیل شجرہ سے تعلق رکھتا ہے) انھیں چچی کے دوسرے بھائی نواب احمد بخش خاں والیٔ فیروز پور جھرکہ (۸) تھے۔ مشہور شاعر نواب مرزا خاں داغ (۱۰) نواب احمد بخش کے پوتے تھے۔ داغ کی ایک بہن ملقیس زمانی بیگم (۱۱) تھیں جو والیٔ جاورہ کے بھائی خان جہاں خاں سے منسوب تھیں۔ انھیں کی صاحبزادی خسرو جہاں بیگم (۱۲) سے ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں یسین محمد خاں نے شادی کی۔ خسرو جہاں بیگم جنھوں نے سرداردلہن کا لقب پایا، اس طرح بیگم غالب کی بھتیجی کی بیٹی اور داغ دہلوی کی بھانجی تھیں۔ سرداردلہن یسین محمد خاں کی دوسری بیوی تھیں اور دوسری اولاد کے علاوہ ان کے بطن سے میاں معظم محمد خاں بھی تھے۔ ان رشتوں کی مزید وضاحت درج ذیل شجرہ سے ہوسکتی ہے۔



غالب کا پیالہ

یسین محمد خاں کے خاندان میں غالب سے عقیدت بالکل فطری تھی۔ چنانچہ بگا بیگم (۱۵) کے حوالہ سے یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ یسین محمد خاں کے صاحبزادے معظم محمد خاں (۱۳) یادگار کے طور پر غالب کا ایک پیالہ دہلی سے بھوپال لیتے آئے تھے بگا بیگم کی روایت پر بہ وجوہ یقین کیا جاسکتا ہے کیونکہ انھیں غالب کے گھرانے میں بہو کی حیثیت حاصل تھی۔ جب غالب کی کوئی اولاد زندہ نہ رہی ... زیادہ زندہ

(باقی صفحہ — پر)

مراسلات

قدیم ترین دیوانِ غالب کی دریافت

غالب صدی تقریبات نے جہاں ایک طرف ہمیں غالب شناسی کی طرف مائل کیا وہاں دوسری طرف "غالبیات" میں اچھا خاصا اضافہ بھی ہوا ہے ہمارے اچھے لکھنے والوں نے غالب کی حیات اور ان کے فکروفن کے بہت سے اہم گوشوں کو اجاگر کیا شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو نے اپنے اس عظیم شاعر کے ساتھ شایانِ شان سلوک کیا اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ غالب پر رسالوں اور کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ دیکھتے ہی دیکھتے منظرِ عام پر آگیا۔

ان تقریبات کا زور ختم ہونے لگا تھا کہ دیوانِ غالب کے قدیم ترین نسخے کی دریافت نے اس میں ایک نئی جان ڈال دی اور غالب کو ایک نئے انداز سے دیکھنے کی ضرورت کا شدید احساس پیدا کر دیا یہاں میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا کہ اس قدیم ترین دیوانِ غالب کی خصوصیات کیا ہیں لیکن اس حقیقت کا انکشاف بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ یہ دیوان کن حالات میں دریافت کیا گیا۔

میں اپنے منصبی فرائض کے سلسلے میں اترپردیش کے کئی اضلاع کا دورہ کرتا رہا تاکہ مخطوطات کا جائزہ لوں اور اگر کوئی نادر چیز ملے تو یوپی آرکائیوز کے ذمہ داروں کو اس کی تفصیلات پیش کردوں اس آوارہ گردی نے میرے اندر تحقیق کا کچھ ایسا ذوق پیدا کر دیا کہ مجھے کبھی کبھی مخطوطات دیکھنے کے لئے ذاتی طور پر بھی سفر کرنا پڑا میرا اپریل ۶۹ء کا سفر امروہہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ ۱۳ر اپریل کو میں امروہہ پہونچا اور وہاں وہ چیز دیکھی کہ بار بار یہی مصرع زبان پر آتا رہا۔

"ایں کہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب"

یہ مجھے کیا معلوم تھا کہ دیوانِ غالب کی بازیافت میرے اس سفر میں مضمر تھی!

جناب توفیق احمد صاحب نے جو اس نسخے کے مالک ہیں ازراہِ کرم مجھے غالب کا یہ دیوان دکھایا اور انھوں نے مجھے اس کی اجازت دی کہ میں اس کا عمیق مطالعہ بھی کروں مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں تھا کہ یہ غالب کے اپنے قلم سے لکھا ہوا نسخہ ہے اور یہ نسخۂ حمیدیہ سے بھی قدیم تر ہے میں نے اس نسخے سے نہ صرف ضروری نوٹ لئے بلکہ اس کے چار صفحات کا فوٹو بھی حاصل کر لیا۔

احتیاط کا یہ تقاضا تھا کہ اس کا تفصیلی تعارف کرانے سے پہلے اس کی ثقاہت کے بارے میں کسی ماہرِ غالبیات کو فوری حاصل کر لیا جائے نظرِ انتخاب مولانا عرشی صاحب پر پڑی جو ہمیشہ میرے اوپر کرم فرما رہے ہیں رامپور پہونچ کر جب میں نے عرشی صاحب کو یہ خبر سنائی اور ان کی خدمت میں متعلقہ نوٹ اور عکس پیش کئے تو اس وقت عرشی صاحب پر جو خوشگوار ردِ عمل ہوا اس کا خاکہ نہیں کھینچا جا سکتا میں تو سمجھا کہ یہ ان کی زندگی کا خوشگوار ترین لمحہ تھا وفورِ جذبات کا یہ حال تھا کہ جب ان کے صاحبزادے اکبر علی خاں صاحب تشریف لائے تو انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "دیکھو جلال الدین تو جبریل بن کر آئے ہیں اور کلامِ غالب لائے ہیں"

جناب عرشی صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں اس نسخے کو مرتب کر دوں لیکن میں نے اپنے عجز کا جو بہر حال حقیقت پر مبنی تھا، اظہار کیا جب میں رامپور سے لکھنؤ اور پھر الہ آباد پہونچا اور وہاں بعض احباب سے ذکر کیا تو ان کے مشورہ سے یہ خبر اخبارات میں دیدی اور ۱۶ر اپریل کو جب الہ آباد پہونچا تو بعض خبر رساں ایجنسیوں کے نمائندوں نے اسی دن میرا انٹرویو لیا اور ان کی آن میں یہ خبر اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے پوری دنیا میں پھیل گئی۔

یہ صحیح ہے کہ راقم سطور نے اس نسخے کو دریافت کیا لیکن آج بھی یہ نسخۂ غالب کے یہ الفاظ دوہرا رہا ہے۔

"کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق"

ضرورت اس کی ہے کہ پرستارانِ غالب اس نسخے پر کام کریں اور اس کی اہمیت کو روشن کریں نسخے کی دریافت کو میں اہم کام نہیں سمجھتا اہم کام تو یہ ہے کہ غالبیات میں اس کا صحیح مقام متعین کیا جائے اور مسلمات کا ایک بار پھر نئے سرے سے جائزہ لیا جائے۔

جیسا کہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں کہ میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس نسخے کی قدر و قیمت پر اظہار خیال کروں لیکن قارئین کی دلچسپی کے لئے کچھ اشعار زیرِ بحث دیوان کے نقل کرتا ہوں جو اس دیوان میں قلم زد ہیں اور غیر مطبوعہ بھی۔

تنک ظرفوں کا رتبہ حد سے برتر نہیں ہوتا — حباب سے بعد بالیدن بھی ساغر نہیں ہوتا
نہیں ہے ضبط جز شایستگی غم آرائی — کہ میں سرمہ چشم داغ میں ہے آہ خاموشاں
پریشانی تسدد پردہ ہے سامان جمعیت — کہ ہے آبادی صحرا ہجوم خانہ بر دوشاں
تماشائے جہاں مفت نظر ہے — کہ یہ گلزار باغ رہ گزر ہے
جہاں شمع خموش جلوہ گر ہے — پر پروانگان بال شرر ہے
ہوئی یک عمر صرف عشق نالہ — اثر موقوف بر عمر دگر ہے
دیکھا نہیں ہے ہم نے بجز نقش پا اسد — غیر از شکستہ حالی و حسرت کشیدگی

مذکورہ بالا اشعار ان قلم زد اشعار میں سے پیش کئے گئے ہیں جن کو غالب نے اپنی ناپسندیدگی اور دیگر وجوہات کی وجہ سے قلم زد کیا ہے۔

(جلال الدین)

دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ کے مالک کا بیان

مرزا غالب کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے دیوانِ غالب کے نادر مخطوطے

لے اس دیوان کی خصوصیات پر ایک مفصل مضمون میں نے سپردِ قلم کیا ہے جو جلد ہی اردوئے معلی دہلی یونیورسٹی میں شائع ہو رہا ہے۔

کے سلسلے میں ۸؍مئی ۱۹۶۹ء کے ہفت روزہ "ہماری زبان" میں جناب نقاد اکبرآبادی ایم۔اے کا مراسلہ دیکھا ایسے نادر نسخوں کے سلسلے میں غلط خبریں بھی چھپ جاتی ہیں اور بعد میں تحقیق کرنے پر ان کا پول کھلتا ہے۔ نیز جعل سازی کے امکانات سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی اس لئے نقاد اکبرآبادی صاحب کا شبہہ کرنا کچھ غیر متوقع بات نہیں ہے لیکن موصوف نے دو باتیں اس مراسلے میں ایسی لکھی ہیں جو ایک تعلیم یافتہ انسان کے قلم سے نہیں لکھی جانی چاہئیں یعنی ایک تو انھوں نے میرے ساتھ نثار احمد فاروقی صاحب پر بھی جعل سازی میں شریک ہونے کا شبہہ وارد کیا ہے دوسرے خریداروں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ قیمت کے تعین میں دھوکا نہ کھائیں پہلی بات تو سرے سے لکھنی ہی نہیں چاہئے اکبرآبادی صاحب کو صرف یہ شبہہ ظاہر کرنا کافی تھا کہ وہ جعلی ہو سکتا ہے اور ماہرین غالبیات کی تصدیق درکار ہے

موصوف نے یہ بھی سوال اٹھایا ہے کہ توفیق احمد چشتی صاحب کو یہ نسخہ کہاں اور کیسے ملا اس لئے اہل علم کی اطلاع کے لئے میں یہ بیان شائع کر رہا ہوں مجھے یہ نسخہ ۵؍اپریل ۱۹۶۹ء کو بھوپال سے ملا تھا اور میں نے ۷؍اپریل ۱۹۶۹ء کے اخبار الجمعیۃ میں اس کا اعلان کیا تھا ۱۰؍اپریل ۱۹۶۹ء کے تمام ہند و پاک کے انگریزی، اردو، ہندی اخباروں میں اور آل انڈیا ریڈیو سے اس کی خبر شائع ہوئی اور ۲۲؍اپریل ۱۹۶۹ء کے ہماری زبان نیز ۲۳؍اپریل ۱۹۶۹ء کے اخبار الجمعیۃ دہلی میں جناب نثار احمد فاروقی صاحب کا بیان شائع ہوا اس نسخے سے متعلق نثار احمد صاحب کا تفصیلی تعارف رسالہ آجکل دہلی ماہ جون ۱۹۶۹ء میں آ رہا ہے مشہور عالم اور محقق عالی جناب حضرت مولانا قبلہ امتیاز علی خاں عرشی رامپوری مدظلہ العالی صاحب کا مضمون اسی رسالے میں ماہ جولائی ۱۹۶۹ء میں شائع ہونے والا ہے اس نسخے کو ملاحظہ فرما کر تصدیق کر دی ہے انھیں جو خوشی حاصل ہوئی اس کا بیان تو الفاظ میں ممکن ہی نہیں۔

میں ۱۹۵۸ء سے قلمی و مطبوعہ کتب اور نادر اشیاء کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا ہوں اور ہندوستان کے تقریباً سب بڑے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں اور کتب خانوں سے مجھے واسطہ رہتا ہے خدا کے فضل سے اس گیارہ سال کے عرصے میں کوئی ایک مثال بھی میری جعل سازی یا بے ایمانی کی پیش نہیں کی جا سکتی۔

اس نسخے سے متعلق مذکورہ بالا تفصیلی مضامین شائع ہونے کے بعد شکوک و شبہات کے سارے بادل چھٹ جائیں گے اور درحقیقت اپنے آپ کو خود منوا لے گی مجھے یہ شکایت نہیں کہ اکبرآبادی صاحب نے شک کیوں کیا۔ لیکن جس انداز میں اس کا اظہار ہوا وہ یقیناً ان کے شایان شان نہیں تھا۔

(توفیق احمد چشتی قادری مالک نیشنل بکڈپو امروہہ ضلع مرادآباد)

محمود شیرانی کے آخری ایام کی ایک تحریر

مشاہیر کی شخصیت کا تعلق اور قابل اعتماد اندازہ ان کی تصنیفات اور تقاریر سے نہیں ہو سکتا۔ صحیح خد و خال تو نجی خطوط اور بے تکلف دوستوں کی صحبت میں نظر آتے ہیں۔ نجی تحریریں اور مکاتیب شائع کرنا پرانے زمانہ میں بداخلاقی سمجھی جاتی تھی لیکن فی زمانہ تو زن و شوہر کے درمیان کی پردہ داریاں "بھی منظر عام پر لائی جا رہی ہیں۔ مہدی حسن کے خطوط اور صفیہ اختر کے دو خطوط کے مجموعے "حرف آشنا" اور "زیر لب" اس کا ثبوت ہیں۔

محمود شیرانی ادبی دنیا میں تعارف کے محتاج نہیں "تنقید شعر العجم" اور "پنجاب میں اردو" آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ اعلیٰ درجے کے محققین میں آپ کا شمار ہے۔ آپ کی ایک دستی رسید راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے۔ جس زمانہ میں ایک ہزار کے نوٹ بند کرنے کا حکومت نے اعلان کیا تھا تو حافظ صاحب مرحوم نے صاحبزادہ خلیل احمد[1] صاحب کو تیئیس نوٹ ایک ایک ہزار کے چھوٹے نوٹوں میں بدلوانے کے لئے دئے تھے جن کی واپسی صاحبزادہ مبارک علی خاں[2] صاحب کے توسط سے کی گئی تھی۔ شیرانی مرحوم کی یہ تحریر ۴؍فروری ۱۹۴۶ء کی مرقومہ اسی سال حافظ محمود شیرانی نے جہان فانی سے کوچ کیا تھا اس لئے یہ تحریر خاص حیثیت کی حامل ہے کیونکہ اس سے نہ صرف شیرانی صاحب کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ مالی حالت کا بھی علم ہوتا ہے۔

باعث تحریر آنکہ

۲۳۰۰۰
مبلغ تیئیس ہزار روپے جو میں نے خلیل میاں کو بغرض تبادلہ چھوٹے نوٹوں میں ۱۸؍جنوری کو دئے تھے آج صاحبزادہ مبارک علی صاحب سے یہ رقم چھوٹے نوٹوں میں تمام و کمال وصول پائی۔ فقط

(محمود شیرانی ۴؍فروری ۱۹۴۶ء)

[1] صاحبزادہ خلیل احمد خاں صاحب خلف کرنل ولی احمد خاں صاحب قدسی مصنف محاورات داغ۔ "باتیں اور باتیں" آپ کی تصنیف ہے جو آپ نے بچوں کے لئے لکھی ہے۔ آجکل تصنیف و تالیف کا کام چھوڑ کر سماجی و فلاحی کاموں میں مشغول ہیں۔

[2] صاحبزادہ مبارک علی خاں نواب زادہ احمد علی خاں رونق کے پرپوتے اور محمود علی خاں خورشید کے داماد ہیں۔ شعر و سخن کا ذوق ورثہ میں ملا ہے۔ محمود شیرانی مرحوم کے شاگردوں میں خصوصی حیثیت رکھتے ہیں شیرانی صاحب مرحوم نے آپ ہی کے توسط سے اپنے سکوں کا ذخیرہ فروخت کرایا تھا۔ تحصیلدار کے عہدہ سے ریٹائر ہوتے تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوتے تو شاید دوسرے مہدی افادی ہوتے۔

نیا دور کا غالب نمبر

مئی ۱۹۶۹ء کے "نیا دور" سے معلوم ہوا کہ نیا دور غالب نمبر کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے یہ بات قابل مسرت ہے کہ اتنی جلد اس کی پہلی اشاعت ختم ہو گئی۔ اس لئے یہ ضروری معلوم ہوا کہ اس میں جو غلطیاں رہ گئی ہیں ان کی طرف متوجہ کر دیا جائے افسوس یہ ہے کہ اب تک کسی نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ قاعدے سے مجھے ان غلطیوں کی طرف ایڈیٹر صاحب نیا دور کو متوجہ کرنا چاہئے تھا لیکن تجربہ یہ ہے کہ وہاں خطوط کے جواب دینے کا قاعدہ نہیں ہے اس لئے مجبوراً ہماری زبان کے ذریعے ان اغلاط کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) صفحہ ۱۰۴ (یہ نمبر صفحے پر درج نہیں ہے) کے بعد "مرزا غالب کی تحریروں کے عکس" کے عنوان سے مرزا غالب کی تحریروں کے عکس دئے گئے ہیں معلوم نہیں یہ عکس کہاں سے حاصل کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک عکس یقیناً مرزا غالب کا نہیں ہے حیرت ہے کہ ایڈیٹر صاحب نے اسے پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہ فرمائی۔ اس میں خود کاتب نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے "از خط کم ربط بندہ سید غلام عباس ساکن کول"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لکھنے والے نے دن تاریخ بھی لکھا ہے جس دن یہ تحریر ختم کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ تحریر مولوی کریم الدین ساکن پانی پت کے پاس خاطر کی وجہ سے لکھی گئی ہے۔ نیچے کریم الدین کا نام بھی بحیثیت مالک کتاب درج ہے۔

(۲) ٹائٹل کے آخری صفحے پر ایک ورق کا عکس ہے جس کے نیچے لکھا ہے "غنی المطالبین کا ایک ورق جس کے حاشیے پر غالب کی تحریر ہے"۔

اس کتاب کا نام غنی المطالبین نہیں ہے بلکہ غنیۃ الطالبین ہے یہ حضرت غوث الاعظم بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف ہے اور اس کے حاشیے پر جن صاحب کی تحریر ہے انھوں نے اپنا نام بھی لکھا ہے نام عبد علی ہے یا محمد علی یہ واضح نہیں ہے مگر یہ یقینی ہے کہ یہ مرزا غالب کی تحریر نہیں ہے "حررہ محمد علی عفی عنہ" کو کون مرزا کی تحریر کہہ سکتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں ایڈیٹر صاحب ان غلطیوں کی تصحیح بھی فرما دیں گے اور دوسری تحریروں کے ماخذ بیان کرنے کی زحمت فرمائیں گے۔

(راقم "ایک خریدار")

فلموں کی پبلسٹی سے اردو غائب

اردو زبان کی شیرینی اور ہمہ گیریت سے کوئی نادان ہی ہوگا جو انکار کرے گا یا ناکہ "کانگریسی ہندوستان" میں سیاسی مصلحت کی بنا پر اردو کسی علاقہ کی زبان نہیں مانی گئی پھر بھی اپنے بل بوتے پر سارے ملک پر چھائی ہوئی ہے۔ یوں تو اسے مٹانے کی طرح طرح سے ادھر مسلسل کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن سب ناکام۔ اردو کا سر کچلنے کے لئے کیا کیا نہ جتن کئے گئے لیکن اس کے باوجود یہ ہر جگہ اپنا سر بلند کئے کھڑی ہے تیزی سے پہلے کی بہ نسبت زیادہ تندرست اور توانا نظر آ رہی ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے فلمی دنیا میں بھی اردو دشمنی کی وبا پھیل رہی ہے۔ وہی زبان جو ہندوستان کی اولین ناطق فلم عالم آرا سے لے کر موجودہ زمانہ کی اکثر و بیشتر فلموں تک میں اپنے بے پناہ حسن و دلکشی کے باعث استعمال ہوتی رہی ہے اب ناعاقبت اندیش فلم سازوں کے غیر منصفانہ سلوک کا شکار ہو رہی ہے۔ پہلے عام طور سے فلموں کی پبلسٹی۔ چھوٹے بڑے پوسٹرز۔ ٹریلرز۔ شو کارڈز اکلارجمنٹس اور بینرز وغیرہ انگریزی میں تیار ہوتے تھے لیکن ادھر زیادہ تعداد میں انگریزی کی جگہ ہندی نے لے لی ہے۔ مجھے اس تبدیلی پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں ہندی کو اس کا مقام ملنا ہی چاہئے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہندوستان کے کروڑوں اردو دانوں کی ضروریات کو نظر انداز کیا جائے ان کے جذبات مجروح کئے جائیں۔ آج ہم عام طور سے دیکھ رہے ہیں کہ فلموں کے ٹائٹل۔ پوسٹرز اور بینرز وغیرہ میں اردو کو دانستہ طور پر کوئی جگہ نہیں دی جا رہی ہے، حالانکہ کاروباری نقطۂ نگاہ سے یہ متعصبانہ حرکت بے حد ضرر رساں ہے۔ جس کا اندازہ آج نہیں تو کل ضرور ہو گا۔ یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ ایک طرف تو ہمارے فلم ساز دل کھول کر اپنی فلموں کو اردو مکالموں اور گیتوں سے مالا مال کرتے ہیں اور خود بھی مالا مال ہوتے ہیں اور دوسری طرف پوسٹرز وغیرہ پر کم از کم ایک کونے میں بھی اردو رسم الخط میں فلموں کے نام نہیں لکھواتے۔ کیا ان کی اس غلط پالیسی کے خلاف آواز اٹھانے کی فوری ضرورت نہیں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی ضرورت ہے اور میں انجمن ترقی اردو (ہند) مرکز اور ہندوستان بھر میں اس کی پھیلی ہوئی شاخوں سے پر زور اپیل کرتا ہوں کہ وہ جلد سے جلد انڈین موشن پکچر پروڈیوسرز ایسوسی ایشن، سینڈ ہرسٹ بلڈنگ، وٹھل بھائی پٹیل روڈ بمبئی ۴ اور فلم پروڈیوسرز گلڈ آف انڈیا لمیٹڈ احاطہ راج کمل کلامندر اسٹوڈیو پریل بمبئی ۱۲ کو اپنے اپنے انگریزی میں لکھے ہوئے مراسلے کے ذریعہ اس اہم مسئلہ کی طرف متوجہ کریں۔ اگر یہ کام فوری طور پر نہیں کیا گیا تو وہ بجا طور پر یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ملک کا اردو داں طبقہ اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور پھر نہ صرف ہندی میں پبلسٹی تیار کرنے کے عادی ہو جائیں گے اور اس بات سے خوش بھی ہوں گے کہ وہ فلموں سے ایک حد تک اردو کو مٹانے میں کامیاب ہو گئے لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسا ہرگز نہ ہو گا اور مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) اور اس کی ہر شاخ ملک کے کونے کونے سے فوراً اپنے مراسلات بھیجنے کا کام شروع کر دے گی۔ اور یہ ایک احتجاج ہو گا جو ایک دن ہمارے فلم سازوں کے موجودہ رویہ میں یقیناً تبدیلی پیدا کر دے گا اور اردو کے سلسلہ میں ان کی کوئی بھی غیر منصفانہ پالیسی کامیاب نہ ہو سکے گی۔

(شہریار عثمانی)

اترپردیش میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے احکامات جاری

الہ آباد:- اترپردیش کے جن ثانوی اسکولوں میں اردو ذریعہ تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد ایک تہائی ہوگی وہاں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے احکامات ریاستی حکومت نے جاری کر دئے ہیں یہ انکشاف لسانی اقلیت کمشنر مسٹر ایم۔ چندر شیکھر نے انجمن ترقی اردو اترپردیش کے جنرل سکریٹری جناب راحت علی خاں سے یہاں ایک گفتگو میں کیا ہے۔ کمشنر لسانی اقلیت نے اپنی رہائش گاہ پر ریاستی انجمن کے جنرل سکریٹری سے ڈیڑھ گھنٹہ تک اردو کے موجودہ مسائل پر بہت صفائی سے گفتگو کی۔ ملاقات کے موقع پر سکشن افسر جناب کرشن کمار سکسینہ بھی موجود تھے اس شکایت پر کہ ضلع پرشید کے پرائمری اسکولوں میں اردو کی تعلیم بالکل ختم ہوگئی ہے کمشنر نے بتایا کہ حکومت کے اعداد و شمار کی روشنی میں ایسے اسکولوں کی تعداد دو ہزار سے زائد ہے جہاں ابتدائی تعلیم اردو میں دی جارہی ہے۔ ریاستی انجمن کے جنرل سکریٹری نے اعداد و شمار کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ یہ تعداد اسلامیہ مکاتیب یا میونسپل بورڈ کے اسکولوں کی ہے ضلع پرشید کے اسکول اس میں شامل نہیں ہیں۔ ثانوی درجات میں سہ لسانی فارمولہ کے بارے میں جناب راحت علی خاں نے تفصیل سے بحث کرتے ہوئے کہا کہ اس مسئلہ میں بھی ریاستی سرکار کا ذہن پوری طرح صاف نہیں ہے اور اس میں اردو کے خواہشمند طلبہ کے لئے قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں۔ اس مرحلہ پر مسٹر چندر شیکھر نے جنوبی ہند کی زبانوں سے سنسکرت کے رشتہ کا ذکر کیا اور پھر یوپی حکومت کے نام پنڈت نہرو کے ایک خط کا حوالہ بھی دیا جس میں انھوں نے سنسکرت کے بارے میں اپنی رائے میں ترمیم کرلی تھی اس لئے میری بھی درخواست ہے کہ سنسکرت کے نفاذ کے بارے میں شدت اختیار کی جائے۔ ریاستی انجمن کے جنرل سکریٹری نے کہا کہ اردو کے پرستار کسی بھی زبان کے دشمن نہیں ہیں جہاں تک سنسکرت کا سوال ہے تو ہندی کے ساتھ دس نمبر کی سنسکرت پہلے سے لازمی ہے اور مزید اردو کے وجود کو خطرہ میں ڈال کر سنسکرت کی راہ نکال جائے تو یہ بھی قرین انصاف نہیں ہے۔ جبکہ کلاسیکل زبان کی حیثیت سے سنسکرت کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ ریاستی انجمن کے جنرل سکریٹری نے ہرسال اردو ٹیچروں کو نوٹس دیتے اور ان کے حقوق ملازمت کو نقصان پہونچانے کے طریقے کو ختم کرنے پر زور دیا اور تجویز رکھی کہ گزشتہ انتظام کی طرح زبان کے اساتذہ (ہندی، سنسکرت اور اردو وغیرہ) کے لئے ایک قلیل مدتی تربیتی کورس کھولا جائے۔ آخر میں انھوں نے کمشنر کو یاد دلایا کہ انجمن ترقی اردو کا اصل مطالبہ تو یہ ہے کہ اردو کو سرکاری یا علاقائی زبان تسلیم کیا جائے لیکن یہ مطالبہ کمشنر کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے اس لئے وہ اس مطالبہ پر زور دینا نہیں چاہتے ہیں لیکن ریاستی انجمن نے متعدد بار اس کا اظہار کیا ہے کہ اردو کو جو بھی حقوق دیے جائیں وہ قانونی شکل میں دیے جائیں۔ کیونکہ اب اردو کے کارکن بغیر قانونی ضمانت کے مطمئن نہیں ہوسکتے ہیں۔ مسٹر چندر شیکھر کمشنر نے نہایت خوش گوار ماحول میں ریاستی انجمن کے جنرل سکریٹری کی شکایتوں اور معروضات کو نہایت غور سے سنا اور وعدہ کیا کہ وہ ضلع پرشید کے اسکولوں اور سہ لسانی فارمولا میں اردو کی تعلیم کے انتظام اور اردو کے قانونی تحفظات کے بارے میں ریاستی حکومت کو توجہ دلائیں گے۔ انھوں نے اردو کی تنظیموں سے اپیل کی وہ عام شکایتوں کے بجائے مخصوص طور پر اسکول اور نام سے یادداشتیں بھیجیں تو وہ زیادہ کارآمد ہوں گی اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ شکایات صحیح ہوں اس موقع پر انھوں نے ایک تنظیم کی اس شکایت کا حوالہ دیا جس میں زور دیا گیا تھا کہ پرائمری اور ثانوی سطح کی اردو نصاب کی کتابوں کی اشاعت سرکار نے بند کردی ہے حالانکہ آج ہی حکومت یوپی نے تقریباً ستر کتابیں اردو کورس کی میرے پاس بھیجی ہیں۔ (قومی آواز)

غیر سرکاری زبانوں کی تعلیم کے لئے مالی امداد

نئی دہلی:- جن علاقوں میں ہندی اور سنسکرت کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں کی حیثیت سرکاری یا ریاستی نہیں ہے وہاں ۷۵ فیصد سے ۹۰ فیصدی تک علاقوں میں ان زبانوں کے سیکھنے کے لئے مالی امداد میں اضافہ کیا گیا ہے ہندوستانی زبانوں کی ترقی کے لئے رضا کار اداروں کو امداد دینے کے متعلق تعلیم اور نوجوانوں کے امور کی وزارت کی اسکیم کے تحت یہ امداد ان مختلف رجسٹر شدہ اور غیر تجارتی اداروں کو دی جاتی ہے جو ریاستی سرکار کی منظوری کے ماتحت مختلف زبانوں کی ترقی کے لئے کام کرتے ہیں۔ مذکورہ وزارت کو توقع ہے کہ مالی امداد کی شرح میں اس اضافے کی وجہ سے ہندوستانی زبانوں کی تعلیم اور ان کے مطالعہ میں نمایاں ترقی ہوگی جس سے مختلف طبقوں کے درمیان بہتر مفاہمت پیدا ہوگی اور اس سے ملک میں قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہوگا۔

کانپور کارپوریشن میں اردو کے حقوق کی بحالی کا مطالبہ

کانپور:- معلوم ہوا ہے کہ مقامی شہری کارپوریشن کے ۴۰ ممبروں نے

مطالبہ کیا ہے کہ کارپوریشن اور اس کی کمیٹیوں کے جلسوں کی کاروائیاں اور ایجنڈے اردو میں بھی جاری کئے جایا کریں۔ کارپوریشن کے افسروں کے دفاتر پر آویزاں تختیوں پر متعلقہ افسر کا نام اور اس کا عہدہ اردو میں بھی لکھا جائے۔ اشتہارات اور ٹینڈر نوٹس وغیرہ اردو اخبارات میں بھی شائع کرائے جائیں۔ علاوہ ازیں کارپوریشن کے تحت چلنے والی لائبریریوں اور دارالمطالعوں میں اردو اخبارات بھی منگانے کا انتظام کیا جائے۔

ٹیٹا گڑھ میں اردو ہائی اسکول کے قیام کی جدوجہد

ٹیٹا گڑھ:۔ ٹیٹا گڑھ میں مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک اردو اور ایک ہندی ہائی اسکول نیز ایک پارک کے لئے دستخطی مہم کا آغاز کیا گیا ہے معلوم ہوا ہے کہ اس مہم کو عوام کی زبردست حمایت حاصل ہے اس سلسلہ میں ایک کنونشن بھی ہو چکا ہے جس میں کئی ممبران اسمبلی نے شرکت کی اور اس امر کی یقین دہانی کی کہ وہ عوام کے متذکرہ مطالبات منوانے کے لئے حکومت پر دباؤ ڈالیں گے۔

بھوپال میں اردو میڈیم اسکول کھولے جائیں

بھوپال:۔ ابتدائی اردو تعلیم کے مسئلہ پر ایک میٹنگ زیر صدارت جناب غضنفر میاں صاحب ہوئی جس میں طے کیا گیا کہ اردو اور متعلقہ اردو کے مسائل کا حل اس میں ہے کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ بھوپال میں اردو میڈیم کے اسکول کھولے جائیں اور ہماری تمام تر توجہ اور کوشش کا رخ اس مسئلہ کی طرف ہونا چاہئے۔

ٹونک میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی وفات پر اظہار تعزیت

ٹونک:۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر جمہوریہ ہند کے سانحۂ ارتحال پر تاج اکیڈمی ٹونک کی جانب سے ایک قرارداد تعزیت پاس ہوئی جس میں ذاکر صاحب کی موت کو ایک عالمگیر سانحہ بتایا گیا۔ تاج اکیڈمی کے سرپرست جناب عزیز الدولہ امیر الملک ہز ہائی نیس نواب محمد اسماعیل علی خاں صاحب بہادر صولت جنگ المتخلص بہ تاج فرمانروائے ٹونک نے اظہار غم فرماتے ہوئے کہا کہ میرے محب مکرم ذاکر صاحب کی وفات حسرت آیات کی اندوہناک خبر نے میرے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مرحوم سے میری قرابت داری ہوتی تھی۔ ان کے جد امجد اور میرے جد امجد میں رشتہ داری اور ربط خاص تھا۔ (نامہ نگار)

دسنہ میں غالب صدی تقریب

دسنہ:۔ انجمن الاصلاح دسنہ کی عمارت میں زیر اہتمام جمعیۃ الطلبہ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ایک ادبی اجتماع کا انعقاد ہوا جس کی صدارت جناب حسن اختر صاحب نے کی۔ جلسے کا آغاز پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی تقریر سے ہوا جس میں انھوں نے اردو کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شاعرانہ عظمت اور شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے زمانہ کا جائزہ لیا، اور ان کی گوناگوں خصوصیات پر بھی اظہار خیال کیا۔ جناب شمیم اختر آزاد نے غالب کے لطیفے سنائے، جناب مہدی مختار، آصف اختر اور شمیم احمد نے غالب سے متعلق اپنے مضامین سنائے، جناب فیاض حسن اور وصی احمد نے غالب کی غزلیں سنائیں، جناب خورشید انور گیلانی نے "غالب عندلیب گلشن ناآفریدہ" کے موضوع پر تقریر کی۔ جناب عبدالقوی دسنوی صاحب نے ایک تجویز پیش کی کہ ہم اہل دسنہ غالب صدی کے موقع پر یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم اردو زبان کی ترویج اور بقا کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ جس پر حاضرین جلسہ نے نہایت مسرت اور جوش و خروش کا اظہار کیا اور وعدہ کیا کہ دسنہ میں اس شیریں اور پیاری زبان کی تعلیم کے سلسلے میں ہر ممکن مدد کریں گے آخر میں صدر جلسہ نے اردو کی ترویج سے متعلق تقریر کی۔ (نامہ نگار)

جموں غالب کمیٹی میں شاد کی تعزیت

جموں:۔ جموں غالب کمیٹی کی مجلس عاملہ نے ۱۲ مئی ۱۹۶۹ء کو نرش کمار شاد کی وفات پر ذیل کی قرارداد منظور کی: "جموں غالب کمیٹی کی مجلس عاملہ اردو کے مشہور شاعر نرش کمار شاد کی جواں مرگی پر اظہار رنج و ملال کرتی ہے۔ مرحوم کی موت جن پر اسرار حالات میں ہوئی ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی ہماری قوم اور سماج ادیب و فن کار کو زندگی کی کم سے کم آسائش مہیا کرنے میں بھی تغافل سے کام لیتے ہیں اہل جموں کے لئے شاد کے بچھڑنے کا غم اس لئے اور بھی شدید ہوجاتا ہے کہ وہ ابھی ایک ماہ پہلے جموں آئے تھے اور کئی شعری نشستوں میں شریک ہوئے تھے۔ غالب کمیٹی شاد کے پس ماندگان اور واحقین سے اظہار تعزیت کرتی ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ مرحوم کی بیوہ کے لئے مناسب پنشن منظور کی جائے"
(سکریٹری جموں غالب کمیٹی)

لسانی اقلیتی کمشنر کے انکشافات

ابھی حال میں لسانی اقلیتی کمشنر نے یوپی کے چند اہم مقامات کا دورہ کیا تھا اور اخباری خبروں کے موجب یہ انکشاف کیا ہے کہ اترپردیش کے جن ثانوی اسکولوں میں اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد ایک تہائی ہوگی۔ وہاں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے

احکامات ریاستی حکومت نے جاری کر دئے ہیں۔ اب تک اس قسم کا کوئی اعلان اخباروں میں حکومت یوپی کی طرف سے نہیں شائع ہوا ہے مگر کوئی وجہ نہیں کہ ہم لسانی اقلیتی کمشنر کے بیان پر اعتماد نہ کریں۔ تاہم مندرجہ بالا اعلان کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اگست ۱۹۴۹ء میں صوبائی وزراء تعلیم کی کانفرنس میں ثانوی اسکولوں میں ذریعہ تعلیم کے بارے میں حسب ذیل تجویز منظور ہوئی تھی۔ (اردو ترجمہ) "ثانوی درجات میں اگر ایسے طلبہ کی تعداد کافی ہو جن کی مادری زبان علاقائی یا ریاستی زبان نہ ہو تو ایسے طلبہ کے لئے اس علاقہ میں علیحدہ اسکول قائم کیا جائے جس میں ذریعہ تعلیم ان کی مادری زبان ہو۔ ایسے اسکول اگر پرائیویٹ سوسائیٹیز نے قائم کئے ہوں تو ان کو منظور کیا جائے اور انھیں قواعد کے مطابق امداد دی جائے۔ گورنمنٹ ایسے تمام سرکاری میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکولوں میں جن میں طلبہ کی کم از کم ثلث تعداد اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہے اس قسم کی سہولتیں فراہم کرے گی۔" مندرجہ بالا تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی تھی۔ کانفرنس میں یوپی کے وزیر تعلیم شامل تھے۔ مگر یوپی میں اس پر عمل درآمد ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ اس تجویز کی مناسب پبلسٹی بھی نہیں کی گئی۔ تجویز پر عمل درآمد کے لئے جن انتظامات کی ضرورت تھی وہ بھی نہیں کئے گئے۔ یوپی میں ڈیڑھ سو سے زائد ثانوی اسکول مسلمانوں کے ہیں جو مسلمانوں کے زیر انتظام چل رہے ہیں۔ ان سب میں ایسے طلبہ کی اکثریت ہے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ مگر پورے یوپی میں ایک اسکول بھی ایسا نہیں جس میں اردو ذریعہ تعلیم ہو۔ وجوہات حسب ذیل ہیں۔ (۱) پرائمری سطح پر اردو کی تعلیم کا معقول بندوبست نہیں۔ (۲) ثانوی درجات میں پڑھائے جانے والے مضامین حساب، جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ میں اردو کی کتابیں نہیں ہیں اور نہ ان کی تیاری کا کوئی بندوبست ہے (۳) اس کا کوئی اطمینان نہیں ہے کہ جن طلبہ نے ثانوی تعلیم اپنی مادری زبان اردو میں حاصل کی ان کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست بھی ان کی مادری زبان میں کیا جائے۔ (۴) ملازمتوں اور زندگی کے دیگر شعبوں میں اردو داں طلبہ کے لئے یکساں مواقع نہیں ہیں۔ (۵) مختلف مضامین کے امتحانات اردو میں لئے جانے کا بندوبست نہیں ہے۔ حکومت کا مندرجہ بالا اعلان خواہ کتنا ہی خوش کن ہو مگر جب تک مندرجہ بالا دشواریوں کو نہ دور کیا جائے، یہ اعلان بھی مثل دیگر اعلانات کے سرکاری فائلوں کی زینت بن کر رہ جائے گا۔ بہر حال اس معاملہ میں ہمیں ایک بار پھر حکومت کو آزمانا چاہئے۔ ان تمام ثانوی اسکولوں کے منتظمین کو جن میں ایسے طلبہ کی تعداد ثلث یا اس سے زائد ہو جن کی مادری زبان اردو ہو، چاہئے کہ وہ بلا تاخیر محکمہ تعلیم یوپی کو اس کی اطلاع کر دیں اور لکھیں کہ منتظمین کی خواہش ہے کہ وہ ان طلبہ کے لئے اردو میں ذریعہ تعلیم کا بندوبست کریں۔ لہٰذا اس کے لئے مناسب کتابیں فراہم کی جائیں تاکہ آئندہ حکومت یہ عذر نہ کر سکے کہ پورے یوپی میں کسی اسکول نے اردو میں ذریعہ تعلیم کی خواہش کا مطالبہ نہیں کیا۔ لسانی اقلیتی کمشنر نے چند اور باتوں کا انکشاف کیا ہے۔ منجملہ ان کے سہ لسانی فارمولا اور سنسکرت ہے۔ موصوف نے پنڈت نہرو کے ایک خط کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ پنڈت جی نے سنسکرت کے بارے میں اپنی رائے میں ترمیم کر لی تھی مگر اس کی کوئی وضاحت کمشنر نے نہیں کی۔ مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پنڈت نہرو اس پر راضی ہو گئے تھے کہ سنسکرت کو سہ لسانی فارمولا میں شامل رہنے دیا جائے۔ پنڈت جی کا اس قسم کا کوئی اعلان اخبارات میں نہیں آیا۔ برخلاف اس کے مرکزی وزیر تعلیم بار بار حکومت یوپی سے کہتے رہے کہ سنسکرت کلاسیکل زبان ہے اس کو سہ لسانی فارمولا میں شامل نہ کیا جائے اور اب تو یہ بات بالکل صاف ہو گئی ہے کہ سنسکرت سہ لسانی فارمولا میں شامل نہیں کی جا سکتی کوٹھاری کمیشن نے اپنی رپورٹ کے پیراگراف ۸.۴۸ صفحہ ۱۹۷ میں یہ بات واضح طور پر کہی ہے کہ کلاسیکل زبان کی اہمیت کا ہمیں احساس ہے یہ بھی احساس ہے کہ قومی تعلیم میں سنسکرت کی اہمیت ہے لیکن ہم اس سے متفق نہیں ہیں کہ سنسکرت یا کسی اور کلاسیکل زبان کو سہ لسانی فارمولا میں شامل کیا جائے۔ مرکزی حکومت نے کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ کو بنیاد بنا کر قومی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا ہے۔ اس کے بموجب بھی سنسکرت سہ لسانی فارمولا میں نہیں پڑھائی جا سکتی۔ موجودہ مرکزی وزیر تعلیم سے پارلیمنٹ میں اس سلسلے میں استفسار کیا گیا تو موصوف نے بھی فرمایا کہ سنسکرت کو سہ لسانی فارمولے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ان سب کے باوجود لسانی اقلیتی کمشنر کا یہ کہنا کہ سنسکرت کے نفاذ کے سلسلہ میں شدت نہ اختیار کی جائے ناقابل فہم ہے۔ کمشنر کو اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہونا چاہئے کہ یوپی میں صرف سنسکرت کو سہ لسانی فارمولا میں شامل کیا گیا بلکہ اسے اتنی اہمیت دی گئی جس سے سہ لسانی فارمولا کا اصل مقصد ہی فوت ہو گیا۔ حکومت یوپی نے ۱۹۶۶ء میں ایک کتابچہ لسانی اقلیتوں کے لئے سہولتوں کے نام سے شائع کیا ہے۔ کتابچے کے صفحہ ۹ پر سہ لسانی فارمولا کے تحت ایڈیشنل ٹیچرس کی تقرری کے اعداد و شمار دیئے ہیں۔ ۱۹۶۵ء-۱۹۶۶ء میں مختلف زبانوں کے جو ایڈیشنل ٹیچر رکھے گئے ان کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں۔

سنسکرت	۴۶۳۸	اردو	۴۵۰
پنجابی	۷۷	بنگالی	۸
گجراتی	۱		

تلگو، مراٹھی، تامل، آسامی وغیرہ زبانوں کا کوئی ٹیچر نہیں تھا۔ مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ یوپی میں سہ لسانی فارمولا کا اصل مقصد پورا نہ ہوگا جب تک سنسکرت کو سہ لسانی فارمولا سے الگ نہ کیا جائے سنسکرت ہمارے ملک کی قیمتی زبان ہے مگر عوامی زبان نہیں۔ اس کو بطور ایک اختیاری زبان کے پڑھایا جا سکتا ہے اور ترقی دی جا سکتی ہے۔

(ظفر احمد صدیقی سکریٹری دینی تعلیمی کونسل یوپی)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ـ پرنٹر و پبلشر سید بنیاد علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا